زولی کوفن سے ایک بڈھا سوئس اور اُس کی جوان لڑکی گاڑی میں سوار ہوئے اور میرے سامنے کی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ بڈھے نے پرانا گرم کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے منہ سے شراب کی بُو آرہی تھی ——— لڑکی نے گرے فلینل پیٹی کوٹ اور سیاہ رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا اور اُس کے ہونٹ بند تھے۔ وہ سیٹ پر بہت آگے کو ہو کر بیٹھی تھی اور اُس کے گھٹنے میرے گھٹنوں کے درمیان آگئے تھے۔ اگر میں اپنی رانیں بند کر لیتا، تو اُس کے گھٹنے اُن کے درمیان آجاتے اور اس کو اپنے باپ کے سامنے اور موٹی استانی کے رُوبرو شرمندہ ہونا پڑتا۔ اس لڑکی کے کالے سویٹر کے نیچے اس کا سینہ یہ بتا رہا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا چپٹے جیسا پیٹ یہ غمازی کر رہا تھا کہ شادی کے آٹھ دس ماہ بعد ہی اس کو طلاق بھی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اس پر گہرے غم کا اطمینان تھا اور وہ آنکھیں بند کیے اپنے بازو سینے پر باندھے بیٹھی تھی۔ بڈھا سوئس اُونگھ رہا تھا اور اس کی موٹی ناک پر شرابیوں اور وریدوں کے الیکٹرون اور پروٹون کا خاکہ بنا ہوا تھا۔ گاڑی تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی اور دائیں بائیں گھاس کے میدان ساتھ بھاگے جا رہے تھے۔ دُور پہاڑوں پر سُرخ چھتوں والے لکڑی کے جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے اور ملگجے آسمان پر اندھیرا لینڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اندر کی روشنی حاصل کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور کرنٹ حاصل کرنے کے لیے لڑکی کے زانو سے اپنا گھٹنا ڈالگا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کالے سویٹر کا دامن ذرا نیچے کھینچا اور اپنی کمر کو ذرا سا ہلا کر گرڈ اسٹیشن آن کر دیا۔ اندر باہر چکا چوند ہو گئی اور رنگ برنگے

اشتہار جلنے بجھنے لگے۔

باباسوئس کوئی کتب فروش دکھائی دیتا تھا جو برن سے نئی کتابیں خرید کر اپنے شہر لے جا رہا تھا اور جس نے کمیشن میں کافی فرانک بچا لیے تھے۔ اس کے چہرے پر کتب فروشوں کی سی سیکنڈ ہینڈ ذہانت تھی اور اس کے جسم سے لائبریری کی مخصوص خوشبو آ رہی تھی۔ اس کی لڑکی کی پنڈلیاں بڑی سڈول اور اس کے کندھے کافی کشادہ تھے۔ اگر میں اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیتا تو بھی اس کے کندھے اسی طرح دکھائی دیتے رہتے اور اس کی ٹھوڑی میرے اُلجھے ہوئے بالوں کے باوجود صاف نظر آتی۔ لڑکی کا زانو، نیلی فون کے کھمبے پر لگی چینی کی گھگی ایسا تھا۔ سفید اور چکنا اور ملائم اور اُس کے اندر سے رُک رُک کر آواز آ رہی تھی:

"WHEN YOU HEAR THE TONE THE TIME WILL BE SIXTEEN HOURS FORTY ONE MINUTES AND THIRTY SECONDS."

میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس کے زانو کا کٹ آؤٹ میرے گوڈے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے فوراً جیب سے سیزن ٹکٹ نکالا اور گلابی رنگ کی پرچی پر نگاہیں جما کر انگلیوں پر دن گننے لگا۔

مجھے فرانس سے چلے آٹھواں دن تھا اور میں نے یہ سارا وقت جنیوا ایسے بیہودہ شہر میں فضول ضائع کر دیا تھا۔ جب میں نے ٹکٹ واپس جیب میں ڈالا تو لڑکی میرے اس بینڈو پن کو دیکھ کر ذرا اور شدت سے مسکرائی اور اپنی انگلی کا ساتھ بنا کر رُخسار پر کھجلی کرنے لگی۔ اس کا قد کاٹھ اور حرکتیں لڑکوں جیسی تھیں، لیکن اس کا جسم گوگوبار کے باہر آئس کریم کھانے والی لڑکیوں جیسا تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ، ماتھا فراخ اور ناک ستواں تھا اور کولہے بہت چوڑے تھے۔ وہ جزیرہ سسلی میں بسے ہوئے عربوں کی نسل سے معلوم ہوتی تھی جنہوں نے وقت گزرنے پر بپتسمہ لے لیا تھا اور گلے میں چاندی کے ہلالوں کے بجائے سنہری صلیبیں لٹکالی تھیں۔ میں اس کی طنزیہ مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکا اور اپنی سیٹ سے اُٹھ کر باہر گیلری میں آگیا۔ دو کھڑکیاں لکڑی پھُول جانے کی وجہ سے جام ہو گئی تھیں اور کھُلتی نہیں تھیں۔ میں تیسری کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور سرسبز گھاس کے میدان دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ گاڑی کو بریکیں لگنے لگیں اور تھوڑی دیر میں گاڑی ایک نہایت ہی

مشکل نام کے اسٹیشن پر رُک گئی۔ نہ کوئی پلیٹ فارم نہ اسٹیشن کی آن بان نہ پورٹر نہ بابو۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا کیبن، ایک خوبصورت سا اسٹیشن ماسٹر، چند سواریاں اور گھاس کا میلوں دُور پھیلا ہُوا میدان۔ مَیں نے بلاوجہ ایک سگریٹ نکالی اور سُلگا کر کش لگانے لگا۔ ایک سواری میرے قریب سے گزری اور ہمارا خانہ چھوڑ کر گیلری میں آگے چلی گئی، پھر ایک لڑکا اندر آیا اور ہمارے والے خانے میں چلا گیا۔ کھڑکی کے فریم پر ایک زنگ آلود پیچ باہر نکل آیا تھا، مَیں نے اپنے ناخن سے اس کو گھمایا، تو وہ گھومنے لگا۔ مَیں نے اس کو اس کی جگہ بٹھانا چاہا، تو وہ ٹائٹ نہ ہُوا۔ اس کا سوراخ کھوکھلا ہو گیا تھا اور اب وہ زنگ کے سہارے اس میں پھنسا ہُوا تھا۔

گاڑی پھر چلنے لگی۔ مَیں نے پیچ کو پکڑ کر زور سے کھینچا، تو وہ اپنے سوراخ سے باہر آ گیا۔ اس پر کتھئی زنگ کا زنگ چڑھا تھا اور کسی کسی بَل پر نارنجی زنگ کا تازہ زنگ بھی چمٹنے لگا تھا۔ مَیں نے سوئٹزرلینڈ کے سووینیئر کے طور پر وہ پیچ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اگر کسی خوبصورت لڑکی کا وجود آپ کے ذہن پر سوار نہ ہو تو سوئٹزرلینڈ واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے۔ باہر کچھ کچھ ٹھنڈک بڑھنے لگی تھی اور دُور دُور تک چیزیں اب صاف بھی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ مَیں نے کھڑکی سے چہرہ گھما کر پہلو اندر کی طرف بدل لیا۔ وہی لڑکی مجھ سے کوئی ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی اور اسی طرح مسکرا رہی تھی۔

"پارلے وو فرانسے؟" اس نے بڑی محبت سے پُوچھا۔

"وو ی" مَیں نے فخر سے جواب دیا۔

"داکیل پائی ایت وو؟" اُس نے پُوچھا۔

"پاکستان!" مَیں نے فخر سے جواب دیا۔

"پاکستان!" وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

مَیں نے ایک منجھے ہُوئے گائیڈ کی طرح پاکستان کے بارے میں تمام کوائف بہم کر دیے اور اس کی طرح مسکرانے لگا، پھر مَیں نے اس کو سگریٹ پیش کیا جسے اس نے کمال محبت اور چاہت کے ساتھ رَد کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ پہلے بہت سگریٹ پیا کرتی تھی، لیکن جب سے اس کی طلاق ہُوئی ہے اس نے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے۔

مَیں نے کہا: "وہ کون احمق تھا جس نے تمہیں طلاق دے دی؟"

"تھا ایک۔" اُس نے مشرقی لڑکیوں کی طرح سر جُھکا کر کہا۔ "تار کے محکمے میں ملازم ہے، فٹ بال بہت اچھا کھیلتا ہے اور ماؤتھ آرگن بجاتا ہے۔"

"کوئی اور لڑکی؟" مَیں نے پُوچھا۔

"پتہ نہیں۔"

"فٹ بال؟"

"شاید نہیں۔"

"ماؤتھ آرگن؟"

"پتہ نہیں ــــ بس ایسے ہی ہم میں طلاق ہوگئی ــــ اس بات کو تو اب چھ مہینے سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔"

"تمہیں یاد آتا ہے؟"

"کبھی کبھی۔"

"اس کے ساتھ گزارے ہُوئے کون سے لمحے سب سے زیادہ یاد آتے ہیں؟"

"جب میں اس کو ٹب میں بٹھا کر نہلایا کرتی تھی۔"

"اس طرح سے تو تمہارے سارے کپڑے بھیگ جاتے ہوں گے؟"

"لو مَیں اسے کپڑے پہن کر تھوڑی نہلایا کرتی تھی۔" اس نے مسکرا کر کہا اور مَیں نے سر نیچے جھکا لیا۔

"تمہارے ماں باپ ہیں؟" اُس نے پُوچھا۔

"دونوں ہیں۔"

"ان دونوں میں سے تم کس سے زیادہ پیار کرتے ہو؟"

مَیں نے کہا: "پیار تو مجھے اپنے باپ سے زیادہ ہے، لیکن ہمارے مُلک میں ماں سے محبت کرنے والے کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے مَیں اپنی ماں سے محبت کرتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" اُس نے حیرانی سے پُوچھا۔

"اس لیے کہ ہماری ماؤں کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے۔"

"تم لوگ جنت میں جانے کے اتنے ہی شوقین ہو؟" — اُس نے پُوچھا۔

"ہر کوئی ہے۔" مَیں نے ایک شریف بچّے کی طرح کہا۔ "تم جنت نہیں جانا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور ذرا دُکھی سی ہوگئی۔

"یہ تمہارے والد ہیں؟" مَیں نے موضوع بدلتے ہوئے پُوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا کرتے ہیں؟"

"لینن برگ میں فوک لور میوزیم کے نگران ہیں۔ ہم لینن برگ میں رہتے ہیں۔ دریائے آکے کنارے۔ تم نے یہ شہر دیکھا ہے؟"

مَیں نے کہا: "دیکھا تو نہیں، لیکن اس کے بارے میں پڑھا ضرور ہے۔"

"بھلا کیوں مشہور ہے یہ شہر؟"

"اس لیے کہ سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر ہے اور سوئٹزرلینڈ دُنیا کا سب سے خوبصورت مُلک ہے۔"

"جھوٹے۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "پکڑی گئی ناچوری۔ لینن برگ میں ٹن فوڈ تیار ہوتا ہے۔ اچار، مُربّے، سُوپ، گوشت... تمہارے مُلک میں سُوپ کے لفافے آتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" مَیں نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "ہم سب وہی سُوپ پیتے ہیں۔"

اتنے میں خانوں کی اور گیلری کی بتیاں جل گئیں اور ہمارے ہیولے واضح ہوگئے۔ اس نے آہستہ سے کہا:

"ادھر کونے میں آجاؤ دروازے کے پاس۔"

جب ہم کونے میں دروازے کے پاس پہنچے، تو ٹائیلٹ کا دروازہ کھلا تھا اور اندر واش بیسن کے اُوپر آئینہ جگمگا رہا تھا۔

مَیں نے کہا: "دیکھو آئینے میں تمہاری صُورت کیسی خوبصورت نظر آرہی ہے۔"

"مَیں ویسے خوبصورت نہیں ہوں۔" اُس نے حیرانی سے پُوچھا۔

"ویسے بھی ہو۔ ویسے کیوں نہیں ہو۔۔۔" مَیں نے شرمندگی کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ "ویسے تو تم بہت ہی خوبصورت ہو، لیکن میرا مطلب تھا۔۔۔ ست آدیر۔۔۔ گویاتُم۔۔۔" پھر مَیں رُک گیا اور اُس کی کمر پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر بولا۔ "یہ پلاسٹک کا بَل ہے؟"

"ہاں!" اُس نے ہولے سے کہا۔

"اور یہ الاسٹک ہے؟"

"ہاں الاسٹک ہی ہوتا ہے! تمہارے مُلک میں الاسٹک نہیں ہوتا؟"

مَیں نے کہا: "وہاں عورتیں اپنے ہاتھ سے سی کر پہنتی ہیں۔ الاسٹک کے بجائے ڈوریاں پہنتی ہیں۔"

اسے ان ڈوریوں سے ذرا گھن سی آئی اور اس نے ناخوشی کے انداز میں سر کو دو مرتبہ جھٹکا۔ مَیں نے اس کے دونوں رُخسار اپنے ہاتھوں میں دبا لیے۔ اُس نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے دانت صاف کیے تھے اور اُس کے مُنہ سے دُربان کی خوشبو آ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے اس کی جلد بڑی ملائم اور خوشبو کے بغیر تھی۔ مَیں نے روم آنے سے پہلے داتا صاحب کے ایک ستون کو چُوما تھا۔ وہ بھی ایسا ہی ملائم اور خوشبو کے بغیر تھا۔ اس نے میرے کوٹ کے بٹن کھول کر اپنے بازو اندر ڈال دیے اور رونے لگی۔ داتا دربار بڑی عمر کا ایک آدمی اسی طرح رو رہا تھا۔ نہ اس کی آواز آتی تھی نہ اس کا بدن ہلتا تھا، پھر بھی وہ رو رہا تھا۔ مَیں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور آہستہ سے کہا: "دیکھو!"

اور جیپ کے پیچھے سے ممتاز مُفتی کی کڑکدار آواز آئی: "دیکھو شاہ جی دیکھو!"

مَیں نے کہا: "ہاں جی دیکھ رہا ہُوں۔"

"یہ کوائی ہے اور یہ کوائی کے پہاڑ ہیں۔"

مَیں خاموش رہا۔

عمر نے میرے کندھے پر سوٹی مار کر کہا: "سر اُوپر اُٹھا کر پہاڑوں کا نظارہ کر۔ کاغان کی وادی شروع ہو گئی ہے۔"

مَیں نے اسی طرح سر جھکائے کہا: "اچھا — جی!"

مسعود نے کہا: "یہ سالا یہاں بھی اپنے لاہور کو ساتھ اُٹھائے پھرتا ہے، اوئے کیا سوچ رہا ہے؟"

مَیں نے کہا: "لاہور نہیں یار، مَیں سوئٹزرلینڈ کو یاد کر رہا ہوں۔"

"لعنت سوئٹزرلینڈ پر۔" عمر جل کر بولا۔ "اُن پہاڑوں میں اور اُن سڑکوں پر ایسا خوف ملتا ہے؟ ایسی دہشت ملتی ہے؟"

"مَیں نے کہا خوف تو نہیں ملتا، لیکن خوفناک لڑکیاں ضرور مل جاتی ہیں۔"

"آپ کو ملی تھی شاہ جی؟" عمّاد نے پُوچھا۔

مُفتی زور سے ہنسا اور اپنے ہاتھ پر بے تالی تالی بجا کر کہنے لگا

مکّے گئے، مدینے گئے، کربلا گئے!

جیسے گئے تھے ویسے ہی چل پھر کے آ گئے

مَیں نے کہا: "یار وَیں ایسا گیا گزرا بھی نہیں، اگر مجھے سوئٹزرلینڈ میں گاڑی میں سفر کرنے کا چانس ملتا، تو ضرور کوئی نہ کوئی لڑکی مجھ کو ملتی۔"

"تو پھر آپ نے گاڑی کو پسند کیوں نہ فرمایا؟" اعظمی نے پُوچھا۔

"اس کی ایک وجہ تو یہ ہے اعظمی کہ میرے پاس کرایہ کم تھا اور مجھے ہچ ہائکنگ کرنی پڑتی تھی اور دوسرے یہ کہ اس زمانے میں یورپ کی لڑکیاں اس قدر ایڈوانس نہیں تھیں۔"

اس پر پانچوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جیپ کا ڈرائیور شیر باز بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔

عمر نے کہا: "دیکھو، یہ سڑک شوگراں کو جاتی ہے۔ بہت ہی خوبصورت علاقہ ہے۔ سرسبز گھاس کے تختے، چیڑ کے خوشبودار درخت اور کچی مٹی کا پہاڑ، پھول ہی پھول۔ پھول ہی پھول۔ پھول ہی پھول۔ واپسی پر تمہیں دکھائیں گے۔"

"واپسی پر تو انہیں جب نظر آئے گا جب یہ اپنے لاہور کا ساتھ چھوڑیں گے۔" عمّاد نے کہا۔ "شاہ جی لاہور کو چھوڑ دو۔ کُنہار کا نظارہ کرو۔ دیکھو دریا کی نُدی۔"

"اِدھر اِس سڑک پر صیب ہمارا ہی کام ہے جیپ چلانا۔ کوئی دُوسرا ٹکس ایک منٹ کو نہیں چلا سکتا۔ بالکل ڈینجرس ہے۔"

مَیں نے کہا: "شیر باز، تم آگے نظر رکھو، میری طرف مُڑ کر بات نہ کرو۔"

"کوئی بات نہیں صیب، ہم کو پریکٹس ہے۔"

بالاکوٹ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا مزار جسے ہم شام کے وقت دیکھنے گئے تھے اور پتھروں پر چلتے چلتے میرے بُوٹ کی ایڑی ٹوٹ گئی تھی۔ مٹی کوٹ کا نالا کافی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جابجا چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے اور قدِ آدم چٹانیں اِدھر اُدھر ایستادہ تھیں۔ اسی مقام پر سیّد احمد شہیدؒ لڑتے ہُوئے شہید ہُوئے تھے۔ کیا خبر وہ پہاڑ کی اِس جانب سے اُترے ہوں یا شاید اُس پگڈنڈی پر سے اُترے ہوں۔ ممکن ہے سکھوں نے اس ٹیلے کے عقب سے حملہ کیا ہو اور ان کی دُوسری ٹکڑی سامنے سے آگئی ہو۔ کچھ دیر لڑائی ترازو کے تول تھی، پھر کانٹا بدلنے لگا۔ امیرالمؤمنین سیّد احمد شہیدؒ خود ایک مورچے پر لڑ رہے تھے۔ اب یہ جنگ کا میدان نہیں رہا تھا، بلکہ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر چھوٹی چھوٹی رزم گاہیں بن گیا تھا۔ رحیم بخش بنارسی حضور کے جانثاروں میں سے تھا۔ اس کا بیان ہے کہ ہمارے آگے سوا سو قدم پر سکھوں اور غازیوں کا ہجوم تھا اور اکثر لوگ کہہ رہے تھے کہ حضرت امیرالمؤمنین اس ہجوم کے اندر ہیں۔ پھر ہم تینوں نے یعنی مَیں نے، اللہ بخش باغبتی نے اور رسول خاں جلالہ والا نے صلاح کی کہ آؤ ہم بھی وہاں چلیں جہاں حضرت امیرالمؤمنین ہیں۔ اس وقت گولیوں کا مینہ برستا تھا اور کارتوسوں کے کاغذ ساری فضا میں تیر رہے تھے۔ اس کے باوجود ہم ادھر کو بھاگے، لیکن اس عرصے میں لڑائی شکست ہوگئی۔ اس آخری معرکے میں میاں لکھمیر، رحیم بخش بنارسی سے ذرا آگے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت امیرالمؤمنین سکھوں کو مارتے ہُوئے ہم لوگوں سے آگے بڑھ گئے۔ ہمارے داہنے طرف نالہ تھا۔ چھ آدمی ہمارے اس نالے سے ہو کر حضرت امیرالمؤمنین کے پاس چلے گئے۔ اس عرصے میں حضرت علیہ الرحمۃ کی طرف سے زخمی ہو کر ناصر خان بجٹ گرام کے آئے۔ اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ حضور اُس ہجوم میں تشریف رکھتے ہیں۔

جیپ جبرید کی طرف جا رہی تھی اور راستے میں جگہ جگہ گوجر، گوجرانیاں، ان کے بچے اور بھیڑوں

کے گلے ملتے تھے۔ شیر باز کہہ رہا تھا:

"یارا جی بہت غریب لوگ ہیں اس علاقے کے۔ خُدا کی شان ہے۔ اُس کے آگے بولا نہیں جاتا۔ وہ دیکھتا ہے ہم اپنا فرض کس طرح سے پورا کرتے ہیں۔"

مسعود کہہ رہا تھا: "واہ واخان بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے بھی بہت سے فرض ہیں۔ ہم پر بھی بڑے کڑے حکم ہیں۔"

دریائے کُنہار دیوانوں کی طرح پتھروں اور چٹانوں سے سر پھوڑ رہا تھا۔ ہم بلند ہو رہے تھے۔ دریا کئی ہزار فٹ نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ مَیں نے کہا: "یارو یہ علاقہ ازل ہی سے اسی طرح کا ہوگا یا مُختلف ہوگا؟"

عُمر نے کہا: "تُو بھی بڑا گھگو آدمی ہے۔ یہ بھی کوئی پُوچھنے والی بات ہے؟ روزِ ازل سے یہ پہاڑ اسی طرح کھڑے ہیں۔ نالے اسی طرح بہہ رہے ہیں۔ برف ایسے ہی گرتی ہے۔ گلیشیئر اسی طرح راستے روکتے ہیں۔ تو سمجھتا ہے یہ علاقہ تیرے پٹھانوں نے بنایا ہے؟"

مَیں نے کہا: "یار میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا، مَیں نے اس کا اعلان کر دیا۔"

مُفتی نے کہا: "بالکل ٹھیک کیا ہے۔ اس وقت ہم آزاد ہیں۔ یہ پندرہ دن بالکل ہمارے ہیں۔ اس میں ہر طرح کا اظہار اور ہر طرح کے اعلان کی اجازت ہے۔"

"لیکن احمقانہ خیالات کے اظہار کی اجازت نہیں۔ پہاڑوں کو دیکھو ہائے ہائے وہ دُور کنچن جنگا کی بَرف پوش چوٹیاں ہیں۔"

مجھے جب بھی عُمر کی طرف سے جھڑکی ملتی ہے۔ تو مسعُود بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ مُسکرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "لیڈر کے حُکم کے بغیر تُو کسی بات کا برملا اظہار نہیں کر سکتا۔ دل میں البتہ سوچ سکتا ہے۔"

"دل میں سوچنے لگا، تو یہ پھر گیا۔" مُفتی نے کہا۔ "یہ پہاڑوں میں بھی اپنی دُنیا ساتھ لے آتا ہے۔"

"بس اسی لیے ہم اس کو سفر پر لانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ سالا بھُونڈ ہے پُروانہ نہیں ہے۔ ادیب نہیں ہے سکرپٹ رائٹر ہے۔"

عمّاد جو ہم سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور فرزانہ شخص ہے، اپنے وجود میں دیوانگی کی ایک جھریٹ بھی رکھتا ہے۔ اس کا پیشہ الیکٹرانکس ہے۔ اس کی تعلیم مغربی ہے۔ اس کا دماغ تجزیہ پسند ہے، لیکن اس کے دل پر ابھی تک اس کے اَن پڑھ باپ دادے کا قبضہ ہے۔ کبھی کبھی ان کا ہاتھ اس کے دل پر سے چھُوٹ جاتا ہے۔ کبھی کبھی پھر اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی چھڑی سے ماتھا اُٹھا کر کہا:

"یارو، شاہ صاحب نے ایک معمولی سی بات پُوچھی کہ علاقے روزِ ازل سے اسی طرح کے ہیں یا بدلتے رہتے ہیں۔ تم لوگ ان کے پیچھے ہی پڑ گئے۔"

اعظمی نے کہا: "شاباش، لڑاؤ شاہ جی کو مولوں سے۔"

عمّاد بولا: "ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے زمانے میں وقت کے بادشاہ سے حضرت خواجہ خضر کی ملاقات ہُوئی ــــ بادشاہ نے فرمایا: 'یا حضرت جو کچھ عجائبات آپ نے اپنی عُمر میں دیکھے ہوں، میرے رُوبرو بیان کرو۔'

حضرت خضر علیہ السّلام نے کہا: 'مَیں نے بہت کچھ عجائبات دیکھے ہیں، مگر اس وقت جو کچھ حاضر ہے اُس کا بیان کرتا ہُوں۔ ایک مرتبہ مَیں ایک شہر میں وارد ہُوا جہاں خلقِ عظیم تھی اور عماراتِ بلند سے آبادی تھی۔ پس مَیں نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ یہ تعمیرات کس زمانے میں ہُوئیں۔ اس نے کہا یہ شہر قدیم ہے اور مجھے نہ میرے باپ کو نہ میرے دادا کو اس کے آغاز اور اس کی بنا کا حال معلُوم ہے۔ شروع سے ایسا ہی آباد اور قائم و دائم ہے۔ پس پانچ سو برس بعد میرا پھر گزر اس شہر سے ہُوا، تو وہ شہر ویران نظر آیا۔ یہاں تک کہ ایک اثر بھی آثارِ عمارت میں سے باقی نہ تھا۔ وہاں ویرانے میں ایک مرد گھاس کھود رہا تھا۔ مَیں نے اُس سے پُوچھا یہ شہر کب خراب ہُوا۔ اُس نے کہا۔ مَیں نے یہ شہر ہمیشہ ہی خراب دیکھا ہے۔ مَیں نے کہا۔ یہ شہر کبھی آباد بھی تھا؟ اُس نے کہا ہرگز نہیں۔ یہاں کی آبادی کا حال نہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ نہ میرے باپ نے یا میرے دادا نے یا اُس کے دادا نے اس کا تذکرہ کیا۔ پس میرا گزر پانچ سو برس کے بعد دوبارہ ہُوا تو دیکھنے میں آیا کہ وہ سرزمین ساری عالمِ آب ہو گئی تھی اور ماہی گیر اس میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑتے تھے۔ اُن سے دریافت کیا کہ کب یہ زمین دریا بُرد ہو گئی؟ اُنھوں نے جواب دیا! افسوس

تم بہت ہی بے خبر ہو جو ایسے کلام کرتے ہو۔ یہ سرزمین ہمیشہ سے عالمِ آب ہی رہی ہے۔ کبھی یہاں کی خشکی کا حال اپنے باپ دادا سے نہیں سُنا۔ پانچ سو سال بعد پھر میرا اُدھر سے گزر ہُوا تو دریا خشک ہو کر زمین برآمد ہُوئی۔ کاشت کار اس میں کھیتی باڑی کر رہے تھے اور عورتیں گھاس کے پُولے باندھ رہی تھیں۔ مَیں نے دریافت کیا کہ کب سے یہ زمین پانی سے نکلی ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہمیشہ سے ہی زمین رہی ہے۔ پس پُوچھا یہاں کوئی دریا نہ تھا۔ اُنہوں نے کہا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ اپنے باپ دادا اور بزرگوں سے سُنا۔ الغرض اس کے بعد بھی جب پانچ سو سال بعد میرا جانا ہُوا، تو ایک عظیمُ الشّان شہر وہاں نظر آیا۔ بڑے بڑے مکان، عمدہ سرائیں، تاجروں کے قافلے اور خوش پوشاک لوگ۔ پس وہاں کے لوگوں سے مَیں نے اس شہر کے آغاز و بُنیاد کا حال دریافت کیا، تو اُنہوں نے جواب دیا کہ بھائی یہ شہر تو ایسا ہی آباد تھا۔ ہمیں اس کے بنا کی تاریخ معلُوم نہیں ۔"

عماد کی بات سُن کر تھوڑی دیر جیپ میں خاموشی رہی، پھر عمر کہنے لگا: "یہ سب داستانیں ہیں۔ مَیں خواجہ خضر وغیرہ کو نہیں مانتا۔"

مفتی نے کہا: "نہ مانو چن جی، بات پر غور کرو۔ بات ماننے والی ہے۔"

اعظمی نے کہا: "یار مُفتی! اب تو پنڈی سے باہر کے لوگوں کو بھی علم ہو گیا ہے کہ تو نہایت ضعیف الاعتقاد ادیب ہے۔"

مفتی نے ہنس کر کہا: "مَیں ادیب بالکل نہیں، صرف ضعیف الاعتقاد شخص ہوں۔"

"اور وہ جو تیرا والد فرائیڈ تھا جس کی تو حرامی اولاد ہے وہ؟" عمر نے پوچھا۔

"وہ"۔ مُفتی نے سر کھُجا کر کہا: "اس سے تو مَیں نے علم حاصل کیا ہے۔ دراصل مَیں ایک HIGHLY EDUCATED SUPERSTITIOUS MAN ہُوں۔"

مسعُود نے قہقہہ مار کر کہا: "لو پٹ لو، کیا پٹتے ہو۔"

شیر باز نے کہا: "یار اجی! اس علاقے کے لوگ بڑے ہی غریب ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔ سامنے ایک بچہ اور اُس کی ماں جا رہے تھے۔ بچے کی گود میں ایک جنگلی مرغی تھی اور عورت کے سر پر میلے چیکٹ جزدان میں لپٹا ہُوا قرآن تھا۔ جب ہم اُن کے قریب سے گزرے تو شیر باز نے

سٹیرنگ سے دایاں ہاتھ چھوڑ کر اپنی اُنگلیوں کو چُوما اور باری باری دونوں آنکھوں سے لگایا۔ مَیں نے سگریٹ کا ٹوٹا لڑکے کے پاؤں کے پاس پھینک دیا۔

شیرباز نے کہا: "اس بچے کی ساری دولت یہ مرغی ہے۔ یاراجی بہت غریب لوگ ہیں اس علاقے کے۔"

عمر نے کہا: "اس سے مُرغی خرید لیں، ناران چل کر روسٹ کریں گے۔"

مسعود نے کہا: "نہیں یار! اس کی پالتو معلُوم ہوتی ہے۔"

لیڈر بولا: "اسی لیے تو خرید رہے ہیں کہ اس کی کچھ مالی مدد ہو جائے گی۔"

شیرباز نے کہا: "یاراجی پُوچھ لیتے ہیں ناں ——— اوہ الاکا،" لڑکا سہم گیا اور اُس کی ماں نے قرآن شریف سر سے اُتار کر اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔ "اوئے مُرغی بیچے گا؟" لڑکے نے نفی میں سر ہلایا تو عماد نے پُوچھا:

"کیوں نہیں بیچتا؟"

لڑکے نے خوفزدہ ہو کر کہا: "جی یہ میری مُرغی ہے۔ مَیں اس کو انڈوں پر بٹھاؤں گا۔"

"تو اَب اس کو کدر اُٹھائے پھرتا ہے؟" شیرباز نے دریافت کیا۔

"جی یہ بیمار ہے اس کو دم کروا کے لا رہا ہُوں۔"

"اچھا اچھا۔" مُفتی نے کہا۔ پھر اپنی جیب سے تمباکو والا پان نکالا، ساتھ ہی ایک روپیہ بھی۔ روپیہ لڑکے کو دے کر مُفتی نے پان مُنہ میں رکھ لیا اور ڈرائیور سے غٹرغوں آواز میں کہا:

"چلو جی۔"

اعظمی نے سر ہلا کر کہا: "یار یہ مُفتی بڑا نیک آدمی ہے۔ رُوپیہ رُوپیہ خیرات کرتا ہے کم نہیں۔"

مُفتی کے منہ میں پان تھا اور پیک سے اس کے کلّے پھُول گئے تھے، نہیں تو وہ کوئی جواب ضرور دیتا۔

جرید میں ہم تھوڑی دیر کے لیے رُکے۔ شیرباز نے کہا: "یہاں اخروٹ کی لکڑی سیزن کرنے کا کارخانہ ہے اور بہت اعلیٰ قسم کا فرنیچر بنتا ہے۔ آؤ آپ کو دکھلاؤں۔"

ہم نے کہا: "چائے کہاں سے پئیں؟"

"چائے ادھر نہیں جی،" شیر باز بولا۔ "چائے کاغان میں چل کر پئیں گے۔ ادھر میرے گرائیں کا ایک ہوٹل ہے۔ بہت فس کلاس چائے بناتا ہے۔"

ہم اس کی فرمائش پر فرنیچر کا کارخانہ دیکھنے چلے۔ ایک اُونچی پہاڑی پر ٹین کی چھت والے بڑے بڑے ہینگروں میں لکڑی کا کام ہو رہا تھا۔ کچھ لٹھے سُوکھ رہے تھے۔ کچھ کو آگ کے قریب رکھا ہُوا تھا۔ ایک بڑھئی پھٹے رندہ رہا تھا اور آٹھ آٹھ آدمی چورس اور ستھری سے اخروٹ کی لکڑی پر پھُول پتیاں کھود رہے تھے۔ شوروم میں تیار مال پڑا تھا۔ پلنگ کے چوکھٹے کی قیمت تین سو رُوپے تھی۔ اس کی پُشت کے تختے پر انگور کی بیل کھُدی ہُوئی تھی اور درمیان میں ایک چھوٹا سا خُوبصورت دائرہ تھا۔ دونوں پٹیوں پر نازک سی بیل کھُدی تھی اور چُولیں بڑی صفائی کے ساتھ بٹھائی ہُوئی تھیں۔

عُمر نے شوروم انچارج سے پُوچھا: "ڈبل بیڈ نہیں بناتے؟"

عمّاد نے اپنی سوٹی عُمر کے گلے میں ڈال کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا اور کہا: "اوئے شرم کر! اس عُمر میں ڈبل بیڈ؟"

مُفتی نے کہا: "اس عُمر میں تو ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔"

شوروم انچارج ہماری کھُلی باتوں کو سُن کر کچھ محجوب سا ہو گیا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

مسعُود نے کہا: "یار، یہ ڈرائی فروٹ ٹرے بڑی سستی ہے۔ بڑی چودہ رُوپے کی اور چھوٹی چھ رُوپے کی۔"

"ایک ایک سب کے لیے لے لو،" مُفتی نے مشورہ دیا، تو شیر باز نے کہا: "واپسی پر لینا یار اجی۔ اس وقت کہاں اُٹھاتے پھرو گے۔"

ڈریسنگ ٹیبل سب کو پسند آیا۔ چھ درازیں، ملائم سطح، آئینے کے لیے بیل دار فریم، قیمت کُل پانچ سو رُوپے۔ اس میں آئینہ نہیں لگا تھا۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی محبُوبہ کا چہرہ اس میں صاف نظر آیا۔ کبھی وہ محبوبہ بیوی بن جاتی۔ کبھی پھر محبُوبہ کا رُوپ دھار لیتی۔ اس کے

کندھوں پر ہمارے ہاتھوں کا دباؤ تھا۔ آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔ کنپٹیوں پر عُمر رسیدگی کے آثار تھے۔ جیب میں پچھلی تنخواہ کے بچے ہُوئے کچھ نوٹ تھے۔ دل میں ریٹائرمنٹ کا کمپوٹر چل رہا تھا۔ محبُوبہ کے بال لبے تھے اور چہرے پر کریم مَل رہی تھی۔ عُمر کے آثار اس کی آنکھوں کے نیچے نمایاں ہورہے تھے، لیکن اس کی مسکراہٹ بڑی فریش تھی ــــ ہم وہاں سے کچھ خریدے بغیر باہر نکل آئے۔ پہاڑی سے اُترتے ہُوئے عُمر نے شورُوم انچارج سے پھر پُوچھا کہ اگر ڈبل بیڈ کا آرڈر دیا جائے، تو کیا بنا سکو گے ؟"

انچارج نے کہا: "بنا تو دیں گے، لیکن آپ کو لے جانے میں بڑی دِقت ہوگی جیپ پر اتنا بڑا چوکھٹا جا نہیں سکے گا۔"

"جائے گا کیسے نہیں یارا" شیر باز نے کہا: "ہم کھول کر لے جائیں گے۔"

جریدکے بعد بھاگل آیا یا اس سے پہلے، مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں۔ میری آنکھوں میں ابھی تک آئینے کے اندر دیکھی ہُوئی صُورت گھُوم رہی تھی۔ دائیں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ تھے۔ بائیں جانب لپکتے ہُوئے نشیب اور گہری کھڈّیں۔ میری نگاہیں سامنے دو بالشت چوڑے راستے پر تھیں، لیکن گوشۂ چشم سے مجھے اردگرد کے نظارے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ترائی میں ایک بھولا سا بچّہ بکریوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ وہ ایک بڑے سے پتّھر پہ بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے پر دُھوپ کی ایک رُوپہلی کرن ناچ رہی تھی۔ مَیں، جس کا دل جرید سے چلتے وقت پانی سے بھرے ہُوئے اسفنج کی طرح بے قابُو ہوگیا تھا، اس لڑکے کو دیکھ کر اور بھی آزردہ ہوگیا۔ وہ بڑا معصُوم اور بھولا بھالا تھا اور اُس کو اپنی یا اپنے والدین کی یا میرے غم کی کوئی خبر نہ تھی۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ بکریاں اس کے اردگرد چَر رہی تھیں اور اسے کسی بات کا بھی علم نہ تھا ؎

اُچے اُچے تکھّے تکھّے کالے شاہ پہاڑ
سوگ رچ ڈُبّی ہو کے بھر دی کبن بار اُجاڑ

چپ چان دی گھوکر اندر
ٹانویں ٹانویں جُھگتے
وِرلے وِرلے گھر

ٹیڈھی راہ تے بیٹھاں تکدیاں رب وی جائے ڈر
پتھر اُتے تیڑوں ننگا اکا باکا کاکا
بکریاں دا راکھا
بے خبرا انجان
اپنی گل نہ سمجھے
ایناں وی نہ جانے
رات نوں سوون لگیّ
توں جدوں دوپٹہ لاہویں
کیہڑے پاسے رکھیں
کیہڑے پاسے سوئیں

عُمر نے نعرہ مار کر کہا: "شاہ جی سو گئے او"
مَیں نے آہستہ سے کہا: "نہیں جی جاگ رہا ہوں"
مسعود نے کہا: "پھر واپس لاہور پہنچ گئے ہو؟"
مَیں نے کہا: "نہیں یار! تمہارے ساتھ ہوں۔ وادی میں"
"تو پھر اس وقت کہاں تھے؟" اعظمی نے پوچھا۔
مَیں نے کہا: "بکریاں چرا رہا تھا اُس بچے کے ساتھ"
"ہیں؟ بچہ؟" اعظمی نے تڑپ کر پوچھا۔ "کون بچہ؟"
"سؤر کا بچہ" عُمر نے قہقہہ لگایا۔
مَیں نے کہا: "نہیں یار، وہ بیٹھا ہے"

سب نے پلٹ کر دیکھا۔ بھولا بچہ ابھی تک پتھر پر بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے پر ابھی تک وہی روپہلی کرن ناچ رہی تھی۔

گوجروں کے قافلے میدانوں سے واپس پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں میں کبھی گرمی نہیں دیکھی۔ یہ حدت اور دُھوپ اور اُمس سے ناآشنا ہیں پہاڑوں

پر دُور دُور اپنی بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ اسی گلہ بانی کے سہارے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب اُونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہلی برف باری ہوتی ہے۔ تو یہ اپنے ریوڑ ہانک کر نیچے اُترنے لگتے ہیں۔ سردی ان کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں سفید بلی کی طرح لپکتی آتی ہے اور یہ آگے آگے نیچائیوں اور نیوانوں پر اُترتے جاتے ہیں۔ نومبر دسمبر تک پاپیادہ چلتے یہ مانسہرہ، نوشہرہ، بالاکوٹ اور حویلیاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ گوجر راولپنڈی تک بھی آتے ہیں، لیکن اس سے آگے نہیں۔ یہاں پہنچتے پہنچتے مارچ کا مہینہ آجاتا ہے، پھر گرمیوں کا تپا ہوا سُرخ بھاگ اپنے روند پر سکتا ہے۔ گوجر اپنا مال مویشی جمع کر کے اُوپر چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پیچھے پیچھے گرمی۔ آگے آگے گوجروں کے قافلے اور ریوڑ۔ گرمی اور ان کے درمیان آٹھ دس میل کا فاصلہ رہتا ہے۔ کاغان پہنچنے پر گرمی کا بگھیلا تھک ہار کر چٹانوں کے اندر سو جاتا ہے اور یہ گھاس بُوٹی کی تلاش میں آگے نکل جاتے ہیں۔

ان کی ساری دولت ان کے گلے ہیں۔ ان کا سارا حُسن ان کی عورتیں ہیں۔ ان کی ساری کاہلی ان کے مرد ہیں اور ان کی ساری چوکسی ان کے کتے ہیں۔ یہ لوگ پتھر اور وحشت کے زمانے سے ذرا بعد کے ہیں اور کاشت کاری اور کھیتی باڑی کے عہد سے پہلے کے ہیں۔ جہاں خُود رَو سبزہ ہوتا ہے پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں گھاس کے میدان ہوتے ہیں ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ دُنیا کے اور کسی مُلک میں اس قدر قدیم اطوار کی اور کوئی قوم آباد نہیں۔ انتھروپولوجی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ان میں گہری دلچسپی ہے، لیکن ایک ادیب کی حیثیت سے مجھے ایسے معاشرتی گروہ اچھے نہیں لگتے۔ کہانیاں لکھنے والوں، داستانیں سُنانے والوں اور فلم سازوں نے خانہ بدوشوں کی زندگیوں پر ایسی ایسی کہانیاں وضع کی ہیں کہ مجھے زہر لگتی ہیں۔ ایک خانہ بدوش دوشیزہ اور ایک شہری بابُو کے درمیان جب محبت کا ڈول ڈالا جاتا ہے، تو مجھے ابکائی آنے لگتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کبھی بھی COMMUNICATION نہیں ہو سکتی اور جہاں کمیونی کیشن نہ ہو، وہاں محبت کس طرح ہو سکتی ہے؟ بھیڑ بکریاں چرانے والی یا غستانی لڑکی یا اُونٹ چرانے والی بلوچی دوشیزہ سے تھرین ہنڈرڈ آٹومیٹک چلانے والا اور اکائی پر ہائی فائی میوزک سُننے والا کس طرح سے محبت کر سکتا ہے یا اس کے حسن سے کس طرح

متأثر ہوسکتا ہے ؛ جو نوجوان ٹیلیویژن کے ٹریویا اشتہاروں کا ہیرو ہو' وہ ہُو بُو ہا ہا کرنے والی ان پڑھ چرواہی سے کیسے متکلم ہوسکتا ہے ؛ اس کے ساتھ وہ کس زبان میں گفتگو کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ کس طرح ڈوئٹ گا سکتا ہے ؟

"پہاڑی کوّے شاہ جی " مسعود نے جیپ کا پردہ اٹھا کر باہر دیکھتے ہوئے کہا : " ڈوئٹ گا رہے ہیں "

مُفتی نے کہا : " یہ ڈوئٹ نہیں چن جی، یہ ان کا سوال سانگ ہے۔ اس سے آگے نہیں ملیں گے "

عماد نے کہا : " کوّوں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ اس پر کینیڈا کے زولوجیکل سنٹر میں بڑی ریسرچ ہوئی ہے اور ماہرین نے اس سلسلے میں تین تھیوریاں قائم کی ہیں "

عمر نے چیخ کر کہا : " لعنت لعنت "

مسعود بولا : " تو علموں بس کریں او تے یار ! "

لیکن مُفتی نے کہا : " یار اس کو بات کرنے دو، کالا علم تو آیا نہیں، شاید کالے کوّے کا علم ہی نصیب ہو جائے " اس پر سب نے احتجاج کیا اور عماد کو اپنے علم کے اظہار کا موقع نہ مل سکا۔

اب کاغان کی بستی قریب آ رہی تھی اور پہاڑ کے دامن میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر گھروندوں اور جھونپڑوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔ شیر باز نے جیپ روک کر کہا :

" یارا جی وہ پُل دیکھو۔ اُدھر دریا کے اُوپر "

ہم نے ترپال سے گردنیں نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن کوئی پُل نظر نہ آیا۔ اس نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر ترپال کی ایک سائڈ اٹھا دی اور کہا :

" وہ جی وہ ۔۔۔ وہ دیکھو اُدھر پہاڑ کے پاس ایک آدمی پُل پر سے گزرنے لگا ہے "

ہم نے دیکھا، دریا کے اُوپر سٹیل کا رسہ تنا ہوا اور اُس پر ایک پھرکی دار پیڑھی چلتی تھی۔ اس آدمی کے ساتھ ایک لڑکا تھا جس نے ایک پوٹلی اٹھا رکھی تھی۔ آدمی کی گود میں سفید رنگ کا ایک لیلا تھا۔ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے سے گلے ملے۔ پھر وہ آدمی لیلا لے کر پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

بیٹے نے پوٹلی اُس کی گود میں دے دی اور پھر کی دار پیڑھی کف اڑاتے، شور مچاتے، دریا کو عبور کرنے لگی۔ آدھی راہ تک پیڑھی اپنے زور میں پھسلتی گئی، لیکن دریا کے عین بیچ LOOP پر آکر رُک گئی۔ اُس آدمی نے ایک ہاتھ لیلیے پر رکھا اور دُوسرا ہاتھ بڑھا کر اُوپر اسٹیل کے رسّے کے پاس لٹکتی ہُوئی ایک رسّی پکڑ لی۔ وہ آہستہ آہستہ اس رسّی کو کھینچتا تھا اور اس کی پیڑھی ایک ایک فٹ دو دو فٹ ہو کر آگے کو بڑھتی تھی۔

شیرباز نے کہا: "یارا جی! یہاں کے لوگ بڑے غریب ہیں۔ اللہ کی شان ہے ان کے لیے کوئی پُل بھی نہیں بناتا۔ بس جو چیز انگریز بنا کر چھوڑ گیا تھا وہی باقی ہے۔"

مسعود نے کہا: "انگریز بڑا حرامی تھا خان! تم انگریز کو نہیں جانتے۔"

"کیوں نہیں جانتا جی، جانتا ہوں" شیرباز نے یقین کے ساتھ کہا: "مَیں نے خود انگریزوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ بڑا بدبخت حرامی تھا۔"

پھر ہم نے جیپ کے اندر گردنیں کر لیں اور شیرباز بسم اللہ پڑھ کر موٹر چلانے لگا۔ مَیں نے کہا: "ہم ناران کس وقت پہنچ جائیں گے؟"

"یہی جی کوئی انشاء اللہ جمعہ کی نماز تک پہنچ جائیں گے، خدا کے فضل کے ساتھ۔"

"او ہو۔ آج تو جمعہ ہے مسعُود!" عماد نے گردن گھما کر کہا۔

"بسم اللہ" مسعُود سر ہلا کر بولا: "جمعہ پڑھیں گے انشاء اللہ۔ ناران کی مسجد میں پڑھیں گے۔"

"شاباش جی یارا، خدا خوش رکھے" شیرباز نے خوش ہو کر کہا۔ "جمعہ ضرور پڑھنا جی۔ ادھر کے لوگ بہت راضی ہوں گے۔ سمجھیں گے آپ ان کے بھائی ہیں، ان کے عزیز رشتے دار ہیں۔ کسی کا دل رکھنا بڑا نیکی کا کام ہے جی۔"

مفتی نے کہا: "یارا مَیں نے کبھی جمعہ نہیں پڑھا۔ مَیں تو آپ سے معافی چاہوں گا۔"

"ناں جی ناں" شیرباز نے کہا۔ "ایسا نہ کرنا۔ خدا کا آپ پر بڑا فضل ہے۔ وہ لوگ بہت خوش ہوں گے کہ شہر سے ہمارے بھائی آئے ہیں۔ ہمارے پنجاب کے بھائی۔"

مَیں نے کہا: "بھائی تو ہم اُن کے ہیں شیرباز، نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"وہ جی فرق پڑتا ہے ناں۔" شیر باز نے آہستہ سے کہا۔ "بھائی کی شکل بھی بھائی سے ملتی ہو اس کی عادت ملتی ہو بات چیت ملتی ہو پھر ہی بھائی ہو سکتا ہے۔ اُدھر بہت ٹورسٹ لوگ آتا ہے یار۔ دریا میں راؤٹ پکڑتا ہے، گھڑ سواری کرتا ہے۔ بڑا خوبصورت رنگ دار پوشاک پہنتا ہے، پر اس کی شکل ناران کے لوگوں سے نہیں ملتی۔ سلام الیکم بولتا ہے، پر اس کا ڈیزائن دوسرا ہوتا ہے۔ اس لیے ادھر کے لوگ اس کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے۔"

"تو پھر کس کا بھائی سمجھتے ہیں؟" عماد نے پوچھا۔

"وہ یار اجی۔" شیر باز نے رُکتے ہوئے کہا۔ "اس کو دوسرے ٹورسٹ کا بھائی سمجھتے ہیں۔ جو ولایت سے آتا ہے۔ ایمبیسیوں سے آتا ہے۔ آپ جمعہ پڑھنے ضرور جانا۔ ان لوگوں کو تیقن ہو جائے گا کہ پنجاب کے بھائیوں کی یہ عادت ہمارے جیسی ہے۔"

"پنجاب کے بارے میں تمہارے خیالات کچھ اچھے نہیں شیر باز۔" اعظمی نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ناں جی ناں۔ خدا کی قسم۔ ہم سرحد کے لوگ تو پنجاب سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ بڑا خوشی کرتے ہیں پنجاب پر۔ لاہور نے بڑا زبردست مقابلہ کیا ہندو کا۔۔۔ وہ کیا بولتا ہے جی اس توپ کو۔۔۔"

"رانی۔" مجھے فوراً یاد آگیا۔

"ہاں جی! رانی رانی۔ بڑا زبردست چان ماری کیا رانی نے۔ ہم ادھر قصہ خوانی میں روز شام کو رانی کی بات کیا کرتے تھے۔"

مسعود نے منہ پچکا کر کے کہا:

"خان یہ رانی کو چلاتا رہا ہے۔"

"خا، یار زندہ باد جی۔" جیپ کو ایک دم بریک لگی۔ "آپ ملٹری کا آدمی ہے؟"

"نہیں بھائی ہم میں ملٹری کا کوئی آدمی نہیں۔ ہم سب ریڈیو کے آدمی ہیں۔" اعظمی نے منہ پچکا کر کے کہا۔ "رانی ایک کیٹروئل آرٹسٹ تھی۔ اس کا ذکر ہو رہا ہے۔"

اس پر سب ہنسنے لگے۔ شیر باز شرمندہ سا ہو گیا۔ تو عماد نے سنجیدگی سے کہا: "یار اپنی

انسٹی ٹیوشن کو اس طرح بدنام نہیں کرتے ۔"

ذرا سی دیر کو جیپ میں خاموشی رہی اور پھر ہم بدنامی کا داغ لے کر کاغان کے گاؤں میں داخل ہو گئے ۔ اس گاؤں میں کچھ کچے پکے چھوٹے چھوٹے گھروندے ہیں جو چٹانوں کی اوٹ سے نظر نہیں آتے ۔ کچھ کوٹھیاں ہیں جو اپنی لمبی چھتوں اور رنگین دیواروں کی وجہ سے صاف نظر آتی ہیں ۔ یہ چند دولت اور سیّدوں کی کوٹھیاں ہیں جو اس علاقے کے، ان پہاڑوں کے اور ان مرغزاروں کے مالک ہیں ۔ کاغان میں داخل ہونے والی سڑک کے نالے کے پل پر سیّدوں کا منشی بیٹھا تھا جو ایک روپیہ فی بھاری اور دو روپے فی گائے کے حساب سے گوجروں سے چرائی کی اُجرت لے رہا تھا ۔ جو ریوڑ چرائی کے لیے کاغان کی وادی میں داخل ہوتے ہیں انہیں یہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے ۔ بیچارے سیّدوں کے لیے آمدنی کا ایک یہی ذریعہ باقی رہ گیا ہے، اسی وجہ سے وہ کاغان چھوڑ کر لاہور اور اسلام آباد میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اور اُنھوں نے ڈیفنس، سوسائٹی، گلبرگ اور رمنا میں اپنی کوٹھیاں بنائی ہیں ۔

شیر باز نے کہا :

"اب چائے پیو جی ۔ چاہے بنچ پر بیٹھ کر پیو، چاہے وہ سامنے اخروٹ کے نیچے ٹھنڈی گھاس پر ۔ یہ میرے گرائیں کی دکان ہے ۔"

ہم سب نے اخروٹ کے درخت تلے بیٹھ کر چائے پینے کا فیصلہ کیا ۔ درخت کے پتے دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے اور اس کی ڈالیوں میں کچے کچے اخروٹ لگے تھے ۔ نیچے گہرے سبز رنگ کی گھاس تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ۔ دریا کے شور کی وجہ سے ہمیں ذرا اُونچا بولنا پڑتا تھا اور ڈھلان کی وجہ سے ٹانگیں پھیلا کر اور ایڑیاں جما کر بیٹھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ۔ عمر بہت اُداس تھا اور اپنی چھڑی کی مُٹھ پر ٹھوڑی لگا کر پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھ رہا تھا ۔ ہم سب کو اس کی اُداسی کی وجہ معلوم تھی اور ہم سب خاموش تھے ۔ گو اس واقعے کو چودہ پندرہ سال ہو چکے ہیں، لیکن اس کی اُداسی کا عالم اب بھی وہی ہے ۔ پہاڑوں میں کھوئی ہوئی محبتیں اور بھولی ہوئی یادیں پھر لوٹ آتی ہیں، جس طرح بارش کے دنوں میں باہر بوندیں پڑتی ہیں، تو انسان کے اندر بھی بارش ہونے لگتی ہے ۔ اُوپر سے تو ٹھیک رہتا ہے، لیکن اندر سے